راہِ انبیاءؑ پر سفرِ شوق

سیّد مناظر احسن گیلانیؒ

گرمی کا موسم تھا۔ذوالحلیفہ' جسے اس زمانہ میں بیرِ علی کہتے ہیں' اس کی مسجد کے عقب میں صاف وشفاف شیریں پانی سے چھلکتی ہوئی باوڑی میں غوطے لگا لگا کر' اور جو تیرنا جانتے تھے انہوں نے تیر کر' احرام سے پہلے غسل مسنون کی مسرت حاصل کی۔احرام باندھ کر اور دوگانہ ادا کر کے یکایک ہم میں ہر ایک یہ محسوس کرنے لگا کہ اِحرام سے پہلے وہ جو کچھ تھا' اِحرام کے کپڑوں کے پہن لینے کے بعد اب وہ باقی نہیں رہا ہے۔سینوں سے زبان پر' اور زبانوں سے ذوالحلیفہ کی قدوسی فضاؤں میں'

لَبَّیْکَ' اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ' لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ
اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَۃَ لَکَ وَالْمُلْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ

کی صدا گونجنے لگی۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سینے پھٹ جائیں گے' روحیں عنصری قفس کو توڑ کر نکل پڑیں گی۔ محسوس ہوتا تھا کہ گویا ہر احرام باندھنے والے کے ہر بُنِ مُو سے وہی نغمہ داؤدی ابل رہا ہے جو آج بھی حضرت داؤد پیغمبر علیہ وعلیٰ نبینا الصلوۃ والسلام کی طرف منسوبہ کتاب زبور میں بایں الفاظ پایا جاتا ہے۔یہ "وادیٔ بکّہ" والا مشہور مزبور (۸۴) ہے۔

۱۔ اے لشکروں کے خداوند' تیرا مسکن کیا ہی دلکش ہے۔میری جان' خداوند کی بارگاہوں کے لیے بے چین اور آرزو مند ہے۔میری روح' اس کے لیے گداز اور پگھلتی چلی جاتی ہے۔

۲۔ میرا من' میرا تن' زندہ خدا کے لیے للکارتا ہے۔

۳۔ اے لشکروں کے خداوند' اے میرے بادشاہ! اے میرے خدا! تیری قربان گاہوں کے پاس گوریّا نے اپنا آشیانہ اور ابابیل نے اپنا گھونسلہ پایا ہے' جہاں وہ اپنے بچوں کو

رکھے۔ مبارک ہیں وہ جو تیرے گھر میں رہتے ہیں' وہ سدا تیری حمد کریں گے۔

۴۔ مبارک ہے وہ آدمی جس میں قوت تجھ سے ہے' ان کے دل میں تیری راہیں ہیں۔

(۵) وہ وادیٔ بکّہ سے گزر کر ایک کنواں بناتے' پہلی برسات اسے برکتوں سے ڈھانپ لیتی۔

(۶) وہ قافلہ بہ قافلہ ترقی کرتے جاتے ہیں۔

اسی قسم کے فقروں کے بعد آخر میں ہے۔

ایک دن جو تیری بارگاہوں میں کٹے ایک ہزار سے بہتر ہے۔ میرے لیے خدا کے گھر کی (یعنی بیت اللہ کی) دربانی' شرارت کے خیموں میں رہنے سے بہتر ہے۔ کیونکہ خداوند ایک آفتاب ہے' اور ڈھال ہے۔ خداوند فضل و جلال بخشتا ہے' ان لوگوں سے جو سیدھی چال چلتے ہیں' کوئی اچھی چیز دریغ نہ کرے گا۔ اے لشکروں کے خداوند' مبارک ہے وہ انسان جسے تیرا بھروسہ ہے۔ (زبور ۸۴)

اور داؤدؑ ہی کیا' صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ میدانِ عرفات میں بعض دعاؤں کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی فرماتے جاتے تھے کہ

ھذہ دعائی ودعاء الانبیاء من قبلی

میری اور مجھ سے پہلے پیغمبروں کی (جو اس مقام پر آئے) یہی دعا تھی۔

اور یہ روایت تو بخاری و مسلم میں پائی جاتی ہے' حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وادی سے گزر رہے تھے جس کا نام وادیٔ ازرق ہے' اور مکہّ مدینہ کے راستہ میں ملتی ہے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ کونسی وادی ہے۔ لوگوں نے کہا کہ وادی ازرق ہے۔ یہ سن کر ارشاد فرمایا کہ مجھے کچھ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ

اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں ڈالے' لَبَّیْکَ' اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ (حاضر ہوا' اے اللہ حاضر ہوا) کے نالہائے زار کے ساتھ خدا کو پکارتے ہوئے' موسیٰؑ اس گھاٹی میں اتر رہے ہیں۔

راوی کا بیان ہے کہ وادیٔ ازرق (نیلی ندی) سے پار ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ثنیہ (موڑ) پر پہنچے۔ دریافت فرمانے پر اطلاع دی گئی کہ اس ثنیہ کا نام ہرشا یا لفت ہے۔ یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ خمیدہ' گھونگھر والے بالوں والی' سرخ رنگ کی اونٹنی پر یونس

بن متی علیہ السلام اسی گھاٹی سے لبیک کہتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ان پر ایک اُونی جُبّہ پڑا ہوا ہے' اور اونٹنی کی نکیل رسی کی ہے۔

بخاری کی بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر بھی اسی رنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (دیکھو' بخاری' کتاب اللباس)

انبیاء کے ہم رکاب

اب یہ تو اللہ اور اللہ کے رسولؐ ہی جانتے ہیں کہ اس "مشاہدہ" یا "رویت" کی نوعیت کیا تھی۔ "کَاَنّیِ اَنظُرُ" (گویا میں دیکھ رہا ہوں) کے الفاظ جو حدیث میں پائے جاتے ہیں اسی سے بعضوں نے یہ سمجھنا چاہا کہ گزرے ہوئے واقعہ کی یاد حافظے میں کسی وجہ سے جو تازہ ہو جاتی ہے اور عہد ماضی کا واقعہ سامنے آ جاتا ہے' کچھ یہی صورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش آئی تھی۔ مگر علماء کا بڑا طبقہ قائل ہے کہ

حضرات انبیاءؑ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں' روزی پاتے ہیں۔ پھر اس میں کیا حرج ہے کہ موسم حج میں حضرات انبیاءؑ بھی اس روحانی زندگی کے ساتھ شریک ہوتے ہوں۔خود ان ہی موسیٰؑ کو رسول اللہؐ نے معراج کے موقعہ پر اس حال میں بھی پایا کہ قبر میں نماز پڑھ رہے ہیں (فتح الباری ج۳: ص۳۲۳)

کچھ بھی ہو' مطلب یہ ہو' یا وہ ہو' میری غرض تو صرف اتنی ہے کہ کرۂ زمین کا پہلا گھر قرآن کی رو سے جو ٹھہرایا گیا ہے' ان حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے اس گھر کی حاضری کا شرف حضرات انبیاءؑ بھی حاصل کرتے رہے ہیں۔اور سچ تو یہ ہے کہ الناس (سارے انسانوں) کے امام بنانے کا وعدہ جس سے کیا گیا' وہی ابراہیمؑ جب کعبہ کے معمار بنے' اور ان کی یہی امامت کبریٰ عملی شکل میں جب "العالمین کے لیے رحمت" بن کر جلوہ پرواز ہوئی' تو دیکھا گیا کہ

یقُولُ لَبَّیکَ لَبَّیکَ لاَ شَرِیکَ لکَ لَبَّیکَ اِنَّ الحَمْدَ وَالنِعمَتہَ لکَ وَالمُلکَ لاَ شَرِیکَ لکَ (صحاح)

وہ بھی کہہ رہے ہیں' حاضر ہوا' حاضر ہوا' تیرا کوئی ساجھی نہیں' حاضر ہوا' ساری ستائش تیرے ہی لیے ہے' ساری نعمتیں تجھی سے ہیں' راج تیرا ہی ہے' تیرا کوئی شریک نہیں۔

پھر دوسرے پیغمبروں اور رسولوں کی حاضری پر تعجب ہی کیوں کیا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ نادیدہ

مثالی ہستیوں کے معائنہ کا احساس اگر ہم میں بھی زندہ ہوتا تو شائد ہم بھی وادی ازرق اور ہرشا کے موڑ پر ان بزرگوں کو پا سکتے تھے جو حج کے موسم میں اس علاقے کے اندر پھیل جاتے ہیں۔ دیکھنے والوں نے تو اپنی کتابوں میں یہاں تک لکھا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے بھی طواف کے وقت ان کی ملاقات ہوئی۔

علم صحیح کا سرچشمہ

لیکن یہ سارا قصہ تو علم واحساس کے ذرائع کی کمی و بیشی کے ساتھ وابستہ ہے۔خیال آتا ہے' مدت ہوئی ویول نامی کسی انگریز کا سفرنامہ میں نے پڑھا تھا۔غالباً" ۱۹۱۱ یا ۱۹۱۰ میں بھیس بدل کر حجاز کا سفراس انگریز نے کیا تھا' اور حجاج کے قافلہ میں شریک ہو کر مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ پہونچا تھا۔اس کے پاس بینائی' شنوائی' ذوق' لمس ' الغرض عام انسانی کہیے یا حیوانی حاسے موجود تھے' لیکن "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدً رَسُوْلُ اللّٰہ" (میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں) کا اقرارواعتراف اچانک جس جدید حاسہ کا اضافہ آدمی میں کر دیتا ہے' بدبخت انگریز سیاح اس ایمانی حاسہ سے محروم تھا۔ان ہی حجاج کے ساتھ' جو لبیک کہتے ہوئے "اِنَّ الْمُلْکَ لَکَ" (راج تیرا ہی ہے) کی یافت اور مشاہدے سے سرفراز ہو رہے تھے' اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے علم کا ذریعہ بنا لینے کے بعد انکو یہی دکھایا جا رہا تھا' اس کے سوا اس جدید حاسہ کے رکھنے والوں کو' یہ واقعہ ہے کہ' اور کچھ سوجھتا بھی نہیں۔ لیکن نابینا اندھا ویول' جانتے ہیں' ان ہی دیکھنے والوں کے جھرمٹ میں شریک ہو کر' جیساکہ اس نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے' کیا سوچ رہا تھا۔اس نے لکھا ہے کہ

> میں اس وقت یہ سوچ رہا تھا کہ ان زائرین کے دل میں (جو ہندوستان سے اپنے خالق اور مالک کے آستانے پر حاضر ہوئے تھے ان ہی کے دل میں) کس قسم کے خیالات آتے ہوں گے جن کے ملک پر غیر قوم حکمراں ہے' جہاں اسلام کا وجود کم و بیش حکومت کے رحم و کرم پر ہے' اور حکام وقت ان کے عقائد کو تمسخر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ (ترجمہ اردو ' سفرنامہ ویول ص ۴۸)

اس کورنصیب' کوردیدہ' ویول غریب کو جب اسی کا پتہ نہ چل سکا کہ ۱۹۱۱ میں جس ملک کے باشندوں پر وہ ہنس رہا ہے' ۱۹۴۷ کی اگست میں وہی ملک اور اسی ملک کے باشندے اس پر اور اس کی قوم پر ہنسنے والے ہیں' اور ان ہی کا دین اور دھرم اس ملک میں دوسروں کے رحم و کرم پر رہ جائے گا جو دوسروں کے عقائد کو تمسخر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اللہ اللہ مستقبل کے گنے چنے چند

سالوں کا پردہ جس واقعہ پر پڑا ہوا تھا' ویول کی نگاہ جب ان پردوں کو بھی چاک نہ کی سکی' اور جو کچھ ہونے والا تھا اسے نہ دیکھ سکی' تو لَهُ الْمُلْكُ (راج اسی کا ہے) اس حقیقت کی یافت میں وہ کیسے کامیاب ہو سکتا تھا۔ وہ ان کو مالک سمجھتا تھا' زمین کا مالک سمجھتا تھا' برّ کا مالک سمجھتا تھا' بحر کا مالک سمجھتا تھا' جو غیروں ہی کی نہیں خود اپنی قوتوں کے بھی مالک نہ تھے۔ دوسرے کی بخشی ہوئی قوتوں کو انہوں نے باور کر لیا تھا کہ واقعی یہ ان ہی کی قوتیں ہیں۔بغیر کسی معاوضہ کے بھیک میں ان کو ملا تھا' جو کچھ ملا تھا' پھر دینے والے نے اپنا دیا ہوا واپس لے لیا' تو کیا یہ کوئی نیا واقعہ تھا جو بنی آدم کے گھرانوں میں پیش آیا تھا!

گزشتہ رسالات اور نبوتوں کی نمائندہ' عالمگیر' آخری نبوت کبریٰ کا شاہد اور گواہ بن کر ویول' سوختۂ اختر ویول بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے علم کا ذریعہ اگر بنا لیتا' تو یقین کیجیے کہ محمدؐ کی رسالت کے گواہوں کو جو کچھ دکھایا جاتا ہے' جو کچھ سنایا جاتا ہے' سب ہی کا دیکھنے والا سب ہی کا سننے والا وہ بھی بن جاتا۔ ازل بھی اس کے سامنے آ جاتا' اور ابد کی حقیقتیں بھی اس پر واشگاف ہو جاتیں' مشکوک باتیں یقینی' اور مشتبہ حقائق قطعی اس کے لیے بھی بن جاتے' جیسے آج غیب کے یہ سارے اسرار ان لوگوں کے لیے اسرار باقی نہیں رہے ہیں جو محمد رسول اللہؐ کی معصوم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں' اور ان ہی کے معصوم کانوں سے سن رہے ہیں۔

خیر میں کیا کہنے لگا۔ عرض یہ کر رہا تھا کہ ذوالحلیفہ کی مسجد سے رخصت ہو کر ہم لوگ اپنی لاری میں احرام کے لباس کے ساتھ بیٹھ گئے۔ خوشی سے سینے معمور تھے۔اس توفیق کا ہر ایک شکرگزار تھا کہ اسی مقام سے احرام و تلبیہ کا شرف ہمیں حاصل ہوا جہاں سے تیرہ سو سال پہلے حجۃُ الوداع کے احرام و تلبیہ کا تاریخی آغاز اس وقت ہوا تھا جب' بخاری کے روایت کے مطابق' دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ ابراہیمی مناسک کی تجدید اور بیت اللہ کی تطہیر کا علم بردار مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہوا تھا' اور مستقبل کے اسی حیرت انگیز نظارہ سے متاثر ہو کر موسیٰ علیہ السلام نے صدیوں پہلے کہا تھا:

> فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔
>
> دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا (تورات استثنا ۲/۳۳)

بلبل کے لیے گل کے ہم قافیہ ہونے کا یہ امتیاز ہی ایسا امتیاز تھا جس کے تصور ہی سے مسرت کی لہریں دلوں میں موج مارنے لگتی تھیں!

اندر کی دنیا

ہم بڑھے چلے جا رہے تھے' ان احساسات کے ساتھ بڑھے چلے جا رہے تھے جن سے نبوت کبریٰ کی شہادت قدرتاً" آدمی کو معمور کر دیتی ہے۔ ہم کچھ نہیں جانتے تھے اور نہ جاننا چاہتے تھے کہ باہر میں کیا ہے۔ اور باہر اگر ڈھونڈھتے بھی تو بن کھیتی والے بیابان میں ہمیں ملتا ہی کیا۔ آسمان کے نیلگوں کناروں کے آغوش میں سبزہ و گیاہ سے خالی پہاڑوں اور چٹیل میدانوں کے سوا باہر میں اور کیا تھا۔

لیکن انسانی نفسیات باہر کی تابع ہوتی ہیں' یا اندر کی ؟ جس کے ہاتھ میں رسی ہو' اگر غلطی سے اس کو وہ سانپ باور کر لے' لیکن آگاہی کے بعد جب وہی سمجھ جاتا ہے کہ جس چیز کو میں پکڑے ہوئے ہوں یہ سانپ نہیں بلکہ رسی ہے' تو میں پوچھتا ہوں کہ دونوں حالات میں اس قسم کی مختلف کیفیتوں سے آدمی کو جو دو چار ہونا پڑتا ہے کیا اس وقت باہر میں بھی کوئی چیز بدلتی ہے ؟ رسی یقیناً ہر حال میں رسی ہی رہتی ہے' اس وقت بھی وہ رسی ہی تھی جب سمجھنے والے نے اس کو سانپ سمجھ لیا تھا' اور جب یہ کھل گیا کہ سانپ نہیں ہے تو اس وقت بھی وہی رسی رہتی ہے جو پہلے تھی۔ تبدیلی جو کچھ بھی ہوئی وہ باہر میں نہیں اندر میں ہوئی۔ تڑپنے والا تڑپ رہا تھا' کانپ رہا تھا' چیخ رہا تھا' چلا رہا تھا' یہ سارے حالات سانپ باور کرنے کے زمانے میں طاری ہوئے تھے اور ہنسنے لگا' مسکرانے لگا' جب سمجھ گیا کہ لَاحَولَ وَلَاقُوَّۃَ جسے میں سانپ سمجھے ہوئے تھا وہ تو رسی تھی' تو یقیناً یہ دونوں متضاد کیفیات اور متخالف واردات کسی بیرونی انقلاب کے نہیں بلکہ صرف اندرونی احساس کی تغیرپذیری ہی کے نتائج تھے۔

پھر لوگ " باہر " میں کیوں ڈھونڈھتے ہیں' دیکھنے کی چیز تو یہ ہے کہ ہمارے اندر کیا ہے۔ ابھی گزرا' ان ہی راستوں سے ویول بھی گزرا تھا' جس کا دل جس کا دماغ ان احساسات سے مفلس تھا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے گواہوں کی جماعت میں داخل ہوئے بغیر پیدا نہیں ہو سکتے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ حرم میں کھڑا تھا اور ان ہی واہی تباہی باتوں کو سوچ رہا تھا جنہیں سوچ سوچ کر اس وقت تو اس غریب کو ہنسی آ رہی تھی' لیکن اسے یہ معلوم نہ تھا کہ چند ہی برسوں کے بعد وہ خود ہنسا جائے گا' اور ان ہی لوگوں کا مسخرہ وہ خود اور اس کی قوم بن جائے گی جن کے عقاید و مسلّمات کو' جیسا کہ اسی کا بیان ہے' اس کی قوم کے حکام تمسخر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ چونکہ اس کے اندر کچھ نہ تھا' اس لیے باہر میں بھی اسے کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔

حالت خوف

دور کیوں جایئے آج دنیا ایک خاص حال سے گزر رہی ہے' خوف کے حال سے گزر رہی ہے'خطرے کے حال سے گزر رہی ہے۔ امریکہ کے بہتیرے ایوانوں میں برا جنے والے بھی کانپ رہے ہیں' کاسمک ریز یا کائناتی شعاعوں' اور ان کے روح فرسا' جاں گداز نتائج کو سوچ سوچ کر کانپ رہے ہیں۔ یورپ بھی لرزہ براندام ہے'ایٹم کے بم کے استعمال کا نتیجہ کیا ہو گا' ہائیڈروجن بم اگر چھوڑ دیا گیا تو تمدن و عمران کے ان سارے مظاہر کا حشر کیا ہو گا'جن کے ساتھ ان کی روحیں لپٹی ہوئی ہیں'اور جو پسماندہ قومیں زمین کے کناروں پر پھیلی ہوئی ہیں' ان پر بھوک کی'قحط کی'وباؤں کی' خانہ جنگیوں کی مصیبتیں مسلط ہیں۔ جس کا آج گزر جاتا ہے' نہیں جانتا کہ' کل اس کے سامنے کن مشکلوں میں آئے گا۔ اونچے ہوں یا نیچے'بڑے ہوں یا چھوٹے' ہتھیار والے ہوں یا نہتے'کوئلے والے ہوں یا لوہے والے'تیل والے ہوں یا بجلی والے' چھکڑے والے ہوں یا ٹینک والے' اکثریت والے ہوں یا اقلیت والے' ہر ایک کے آگے خطرات ہی کے بھوت دانت نکالے کھڑے ہیں۔ ہر سوچنے والا جب سوچتا ہے تو پھاڑ دینے والے چنگلوں'اور نوچ کر رکھ دینے والے ناخنوں کے سوا اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ آگ برس رہی ہے'پگھلے ہوئے لوہے اور سیسے کی بارش ہو رہی ہے' چھریاں گر رہی ہیں' بھالے لٹک رہے ہیں' ہر طرف کھنچی ہوئی کمانوں اور تنی ہوئی تلواروں کی پرچھائیاں جھانک رہی ہیں' زندگی "موت" کے خطرے میں گھر کر "موت" سے زیادہ موذی اور تکلیف دہ بن گئی ہے۔ جو شہروں میں ہیں ان پر ڈاکے پڑ رہے ہیں'چوروں کے دھاوں سے تنگ آ گئے ہیں' اور جو دیہاتوں میں ہیں ان پر بھیڑیے واقعی بھیڑیے اور لکڑ بگھے چھوٹ پڑے ہیں۔

خدائے قادر و مقتدر

پھر یہ زندگی کیا ہے ؟ یہ دنیا کیا ہے ؟
آسمان و زمین کا یہ مجموعۂ کائنات کیا ہے ؟

غور کیجیے'ان سوالوں کے متعلق اندر کا ایک احساس یہ ہے کہ صرف بکھرے ہوئے ذرات اور منتشر عناصر کا یہ ایک اتفاقی مجموعہ ہے' جو کسی کے قابو میں نہیں ہے۔ اس کی مقابلہ میں دوسرا ذہنی شعور'اور فکری تاثر یہ ہے کہ

ایک حیؔ و زندہ قوت سب کو تھامے ہوئے ہے'جسے نہ غنودگی چھوتی ہے اور نہ نیند پکڑتی ہے۔ آسمانوں میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے' اور زمین'زمین پر جو کچھ ہے وہ

بھی اسی کا ہے۔ (اس کی پیدا کی ہوئی اس دنیا میں) کوئی سفارش کرنے کی قوت بھی نہیں رکھتا (گویا بھیک بھی نہیں مانگ سکتا) جب تک کہ سفارش کرنے کا اذن وہی نہ دے۔ آگاہ ہے وہ ان تمام باتوں سے جو (آدمی) کے آگے ہیں اور جو اس کے پیچھے ہیں۔ اس کے علم و دانش میں کیا کیا ہے اس کی خبر کسی کو نہیں' مگر وہی کچھ بتانا چاہے۔

اس کے (اقتدار) کی کرسی ہی میں سمائے ہوئے ہیں' آسمان بھی اور زمین بھی' اور آسمان و زمین کے اس مجموعہ کی نگرانی سے وہ کبھی درماندہ نہیں ہوتا۔

یقیناً احساس کی اول الذکر نوعیت ہو' یا نفسیاتی تاثر کی دوسری شکل ہو' دونوں حالوں میں "باہر" جوں کا توں رہتا ہے' مگر کیا ان دونوں شعوری کیفیتوں کے ذہنی نتائج اور دماغی انفعالات جو "اندر" میں پیدا ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں' دونوں کی نوعیت کیا ایک ہی ہو گی۔ رسی کو جو سانپ باور کیے ہوئے ہے' اور اسی رسی کو جو سمجھتا ہے کہ سانپ نہیں وہ تو رسی ہے' دونوں کی ذہنی کیفیت کیا ایک ہی ہو گی ؟ خصوصا اسی کے ساتھ جب یہ بھی سوچا جائے کہ فکر کے اوّل الذکر قالب کی بنیاد صرف جہل اور نہ جاننے پر مبنی ہے۔ یعنی صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ گوناگوں کثرتوں کا یہ مجموعہ جس کا نام عالم ہے' اس کا کوئی شیرازہ بند اور نگراں بھی ہے' ہم اسے نہیں جانتے' یا ہمارے پاس اس کے فیصلہ کا کوئی غیر مشتبہ' قطعی ذریعہ نہیں ہے۔ برخلاف اس کے ثانی الذکر ذہنیت کی تعمیر اس علم سے ہوئی ہے جو قطعاً معصوم ذریعہ سے حاصل کیا گیا ہے' جس میں شک و شبہ کی گنجائش کسی راہ سے پیدا ہی نہیں ہو سکتی' الّا یہ کہ کوئی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے گواہوں کی جماعت ہی سے (العیاذباللہ) خارج ہو گیا ہو۔

اور میرا تو خیال یہی ہے کہ اس علم کے بعد بھی شک کی تلخیوں اور کڑواہٹوں کو کوئی اپنے اندر اگر پاتا ہے تو اپنی ذہنی کیفیت اس کو ان ہی لوگوں کی جیسی نظر آتی ہو گی جو مانتے ہیں کہ عالم کا یہ نظام کسی قادر و مقتدر حیّ وقیوم کے چلانے کے بغیر چل رہا ہے' اور یہ کہ یہاں کی ساری کثرتیں اختیار و ارادہ کی کسی وحدت کے ساتھ وابستہ نہیں ہیں' تو اس کو خود اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے کہ آخری نبوت' اور عالمی رسالت کی گواہی دینے والوں کی جماعت سے کیا تو خارج ہو گیا ہے ؟

مومن عورت کا شہر

بہرحال آگے کی طرف جس وقت ہماری لاری تیزی کے ساتھ بھاگی چلی جا رہی تھی' اس

وقت ہم باہر کے نہیں بلکلیہ اپنے اندرونی احساسات ہی کے دباؤ کے نیچے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ پردے کے بعد پردے ہٹتے چلے جا رہے تھے۔ اپنی جدہ ماجدہ' سیدہ ہاجرہ' ملکہ مصر نگاہوں میں گھوم رہی تھیں۔ کرۂ زمین کے سب سے بڑے مقدّس شہر البلدالامین کی بنیاد رکھنے والی اپنی یہی ماں' ایسا معلوم ہوتا تھا' کہ سامنے سے گزر رہی ہیں۔ پوچھتی ہیں' مردوں نے بڑی بڑی آبادیاں بنائیں' لیکن عورت کے بسائے ہوئے شہر کے مقابلہ میں تم مردوں ہی کی مرتب کی ہوئی تاریخ کیا بتا سکتی ہے کوئی شہر یا کوئی قصبہ' کوئی گاؤں' کوئی کھیڑا ایسا ہے جو اتنا ہی متبرک ہے' اتنا ہی مقدس' خالق کی نگاہوں میں بھی اتنا محبوب' اور اس کے دوستوں کی نظروں میں اتنا پیارا ہو' جتنا کہ بے آب و گیاہ والی اس وادی کی یہ بستی ہے۔ گویا بخاری کے تاریخی الفاظ

لیس بمکتہ یومئذ احد ولیس بھا ماء

جب سیدہ ہاجرہ پہلی دفعہ اس سر زمین میں پہونچیں جس کا نام اب مکہ ہے تو اس وقت وہاں کوئی نہ تھا' اور نہ اس علاقے میں پانی تھا۔

حافظے کے خزانے سے باہر نکل نکل کر ایسا معلوم ہو رہا تھا میری نظروں کے سامنے کھڑے ہیں۔ یاد آتا چلا جا رہا تھا کہ پانی کا وہ زمزی سوتا جس سے خدا ہی جانتا ہے کہ اس وقت تک کتنے پینے والے پانی پی چکے ہیں' اور آئندہ ہر سال آ آ کر رہتی دنیا تک پیتے چلے جائیں گے' اس پتھریلے خشک بیاباں میں پانی کا یہ عجیب و غریب سوتا' اسی پاک خاتون کی دوڑ دھوپ کی بدولت برآمد ہوا تھا۔ سبق پر سبق مل رہا تھا۔ جہاں کوئی نہ تھا' ایک ننھے منے شیرخوار بچے کے ساتھ یہ بہادر عورت اسی سنسان وادی میں تن تنہا دن ہی نہیں' بلکہ بھیانک اور ڈراؤنی راتوں کے گزارنے پر صرف اس لیے آمادہ ہو گئی کہ اپنے خاوند ابراہیم علیہ السلام سے یہ دریافت کرنے پر

اِلٰی مَنْ تَتْرُکُنَا تم ہمیں کس پر چھوڑ کر چلے ؟

جوں ہی کہ "**اِلَی اللّٰہ**" (اللہ پر چھوڑ کر) کا جواب علم کے غیر مشتبہ ذریعہ (وحی ابراہیمی) سے ان کے کانوں تک پہونچا' تو جیسا کہ بخاری میں ہے :

"**رَضِیْتُ بِاللّٰہ**" میں خوش ہوں اللہ کے ساتھ

کے الفاظ سے اسی عورت نے اعلان کیا کہ اس کے دل میں نہ خوف ہی رہا ہے نہ ہی ملال۔ دل مطمئن تھا' دماغ نے یہ سوچنا ہی چھوڑ دیا کہ اس دن کے بعد جو رات آئے گی' اور رات کے بعد پھر دن آئیں گے' یوں ہی شب و روز کا یہ سلسلہ تنہائی کی اس زندگی میں ہم پر جب گزرے گا' تو اس وقت کیا ہو گا۔ نہ چوروں کا ڈر ان کو سہاتا اور لرزاتا تھا اور نہ ڈاکوؤں اور لیٹروں کے تصور

سے آنکھیں پتھراتی تھیں۔ سانپوں اور بچھوؤں' درندوں اور گزندوں کا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی سوال ہی اس کوہستانی وادی میں ان کے لیے باقی نہ رہا تھا۔ اور سب سے زیادہ دلچسپ مسئلہ یہ ہے کہ بجز اس زنبیل (جراب) کے جس میں کھجوریں تھیں' اور ایک مشکیزہ کے جس میں پانی تھا' معاشی اطمینان کا کوئی ذریعہ ماں اور بچے کے لیے یہاں موجود نہ تھا۔ لیکن اللہ کے ساتھ وہ خوش ہو چکی تھیں' وہی جن کی اولاد اور جن کے نام لیواؤں کے لیے کروروں کی تعداد میں بھی خوشی اور مسرت کا لفظ بے معنے ہو چکا ہے۔

آہ! اسی شیر دل خاتون کی نسل سے پیدا ہونے والے اور ان کی تاریخ پر فخر کرنے والے' ان کے کمالات کے گیت گانے والے' مردوں کا کوئی ذہنی مشغلہ اکثریت و اقلیت یا معاشی سہولت اور دِقّت کے تذکروں کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہا ہے۔ حالانکہ جیسے ان بیوی صاحبہ کو ان کے شوہر ابراہیم علیہ السلام اللہ پر چھوڑ کر گئے تھے' اسی طرح جس پیغمبر کی امت میں مردوں کا یہ گروہ اپنے آپ کو شمار کرتا ہے' انہوں نے بھی ان کو اللہ ہی کی حفاظت میں بایں الفاظ

فَاللّٰہُ خَلِیْفَتِیْ عَلٰی اُمَّتِیْ اللہ ہی میرے بعد میری امت کا نگراں ہے

دیا تھا۔ لیکن جن کی ماں نے تنہائی اور بے کسی کی اس تاریخی گھڑی میں **رَضِیْتُ بِاللّٰہِ** (میں خوش ہوں اللہ کے ساتھ) کے لنگر سے اپنے دل کو باندھا تھا' اسی ماں کے بچے جب گھبراتے ہیں' اور مستقبل کے آنے والے دنوں' اور ان آنے والے دنوں میں پیش آنے والے واقعات سے جو جاہل ہیں' وہ ان ہی کے متعلق کچھ فرضی تصورات کو خود گھڑتے ہیں' اور اپنے ان ہی خود تراشیدہ خیالات سے وہ خود بھی ڈرتے ہیں دوسروں کو بھی ڈراتے ہیں' خود بھی بھڑکتے ہیں دوسروں کو بھی بھڑکاتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ کی انجانی باتوں کو واقعی وہ جانتے ہیں' یا زندگی کے گزرے ہوئے دنوں میں آئندہ کے متعلق جو باتیں یہ سوچتے یا فرض کرتے رہے ہیں ہمیشہ وہی واقع بھی ہوتی رہی ہیں۔ گویا غیب کی طرف جو تیر بھی وہ چلاتے رہے ہیں' اس کا تجربہ ان کو ہوا ہے کہ وہ ہمیشہ نشان ہی پر بیٹھتے رہے ہیں اور نشانے سے کبھی نہیں چوکے ہیں۔

خدائے رحمان و رحیم

وہ اللہ کو نہ مانتے' تو یہ بات ہی دوسری ہوتی۔ لیکن یہ مانتے ہوئے کہ کائنات کا شیرازہ ایک زندہ و بیدار' ہمہ اقتدار' ہمہ اختیار قوت کے ساتھ بندھا اور پھندا ہوا ہے' وہ یہ بھی جانتے اور مانتے ہیں کہ لطف و مہربانی' رحم و رافت کا تجربہ جس کسی کو کسی سے بھی پہلے ہوا ہو' یا اب ہو رہا

ہو' یا آئندہ ہو سکتا ہو' خواہ وہ ماں باپ' بھائی بہن' بیٹے بیٹیاں ہی کیوں نہ ہوں' اس سلسلے میں سب سے بڑی رحم کرنے والی کائنات کی یہی اقتداری قوت ہے۔ براہ راست خود اسی نے اپنی خصوصیت یہ ظاہر کی ہے کہ وہ **"ارحم الراحمین"** ہے۔ اسی کی تشریح کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ۱۰۰ حصوں میں سے صرف ایک حصہ رحم کا مخلوقات میں تقسیم ہوا ہے' رحم کے اسی ایک حصہ کے یہ مظاہر ہیں جن کا ہم ماؤں کی مامتاؤں میں' باپوں کی مہربانیوں میں' رشتہ داروں' عزیزوں' قریبوں کے خونی تقاضوں میں' نہ صرف انسانوں میں بلکہ پرندوں میں' چرندوں میں' درندوں میں' الغرض ساری جان رکھنے والی ہستیوں میں' محبت کی نمائشیں جن جن شکلوں میں بھی ہو رہی ہوں' یقین دلایا گیا ہے کہ یہ سب کچھ اسی ایک حصہ کا اثر اور نتیجہ ہے جو مخلوقات میں خالق کی طرف سے تقسیم ہوا ہے' اور ننانوے حصے اسی رحمت کے **اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْن** کی ذات پاک ہی تک محدود ہیں۔

الغرض وہی الرحمٰن بھی ہے الرحیم بھی ہے' اپنے بندوں پر رؤف بھی ہے' ان کا ودود یعنی بہت بڑا چاہنے والا اور سب سے زیادہ ان سے محبت کرنے والا بھی وہی ہے۔ یہ ساری باتیں ان کے ایمان کے جوہری عناصر ہیں' بایں معنی کہ ان میں سے کسی ایک بات کا انکار ہی نہیں' بلکہ اس کے متعلق شک اور تذبذب کی کیفیت اپنے دل میں وہی پا سکتا ہے جو قرآن کو اللہ کا کلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا صادق و راست باز رسول (العیاذ باللہ) نہیں مانتا۔

نفع و ضرر کا اختیار مطلق

اور یہی کیا' میں تو کہتا ہوں کہ قرآن کی ایسی آیتیں' مثلاً

اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَنْفَعُکُمْ شَیْئًا وَّلَا یَضُرُّکُمْ اُفٍّ لَّکُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ

(الانبیاء ۲۱ : ٦٦)

کیا تم اللہ کے سوا ان چیزوں کو پوجتے ہو جو تم کو نہ کچھ نفع ہی پہونچاتی ہیں اور نہ ضرر' تف ہے تم پر اور ان چیزوں پر جنہیں تم پوجتے ہو۔

یا ارشاد ہوا ہے :

یَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَضُرُّہٗ وَلَا یَنْفَعُہٗ ذٰلِکَ ھُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِیْدُ (الحج ۲۲ : ۱۲)

وہ پکارتا ہے اللہ کے سوا ان چیزوں کو جو نہ ضرر ہی اسے پہونچاتی ہیں اور نہ نفع' یہی ہے دور رس گمراہی۔

یہ اور اسی قسم کی آیتوں کی قرآن میں کیا کمی ہے جن کا حال یہی ہے کہ خالق کائنات کے سوا جتنے الٰہ اور معبود بنا لیے گئے ہیں' نہ نفع رسانی کی قوت وہ رکھتے ہیں اور نہ ضرر رسانی کی۔

پھر ان ڈرانے والوں اور ڈرنے والوں کو سوچنا چاہیے کہ خالق کو معبود بنا لینے اور اس کو اپنا الٰہ ٹھہرا لینے کے بعد بھی اگر وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ مصیبت جب آئے گی تو جیسے مشرکوں کے جھوٹے معبود غیر مفید بن کر رہ جاتے ہیں اسی طرح انکا اللہ بھی مصیبت کی ان گھڑیوں میں کیا غیر نافع بن کر رہ جائے گا اور ان کے کام نہ آئے گا۔ اللہ اللہ اگر واقعہ کی صورت حال یہی ہے تو پھر مشرکوں کے معبودوں اور ان لوگوں کے معبود میں کیا فرق رہ جائے گا جنھوں نے مخلوقات کو چھوڑ کر کائنات کے اس خالق اور مالک کو اپنا معبود اسی کے حکم سے بنا لیا ہے جس کے بس سے کوئی چیز باہر نہیں ہے۔

مَاوَعَدَنَااللّٰهُ وَرَسُولُهٗ اِلَّاغُرُوْرًا (الاحزاب ۳۳ : ۱۲)

اللہ اور اس کے رسول نے نہیں وعدہ کیا تھا مگر صرف فریب

اس احساس کو تو قرآن نے نفاق کی علامت قرار دیا ہے۔ پھر جو ان وسوسوں میں مبتلا ہیں کہ وقت آنے پر خدا بھی گول ہو جاتا ہے' اور اپنے پوجنے والے مخلص بندوں کو وہ بھی چھوڑ دیتا ہے' ان کو اپنے اپنے دلوں کا جائزہ لینا چاہیے' اور غور کرنا چاہیے کہ آخر وہ کیسی باتیں سوچ رہے ہیں۔ اگر خالق کا حال بھی وہی ہے جو حال مخلوق معبودوں کا قرآن نے بیان کیا ہے' تو الٰہ اور معبود کی ان دو قسموں میں فرق ہی کیا باقی رہا؟

ہاجرہؑ کی داستان ایقان

میں پھر دور نکل گیا۔ گفتگو اس پاک بستی کی بنیاد رکھنے والی ستنا ہاجرہ علیہا السلام کے متعلق ہو رہی تھی کہ "الیٰ اللہ" کی خبر اپنے شوہر سے پانے کے بعد "میں خوش ہوں اپنے اللہ کے ساتھ انہوں نے جو فرمایا تھا' یا بعض روایتوں میں ہے کہ اسی کے ساتھ ہی حَسْبِی کا لفظ بھی ان کی زبان پر جاری ہوا' یعنی اللہ میرے لیے کافی ہے' بلکہ بخاری والی روایتوں میں سے ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ ستنا ہاجرہ نے اس موقعہ پر کہا کہ **اذالا یضیعنا** ' اگر ایسا ہے ' یعنی خدا کی حفاظت میں جب دی گئی ہوں ' تو خدا مجھے ضائع ہونے نہ دے گا۔

یہ کتنی حیرت انگیز' سبق آموز بات تھی۔ ایک عورت یقین کی اس چٹان پر ڈٹ سکتی ہے' اور ڈٹ گئی۔ دنیا جانتی ہے اس پر قدم جمانے کے بعد پھر اس کے پاؤں ایک لمحہ کے لیے نہ ہلے اور نہ ڈگے۔ اور اسی کا یقین مستقبل کی تاریخ بن گیا۔ تقریباً چار ہزار سال بعد ہم اس شہر' پاک شہر کی طرف جا رہے تھے جو ان بیوی صاحبہ سے آباد ہونے کے بعد آباد ہی رہا' اور اب تک آباد

ہے' اور جب تک کہ وہی وقت نہ آجائے کہ خاکی دنیا کا نظام ہی برباد ہو جائے' ہمارا ایمان ہے کہ وہ آباد ہی رہے گا۔

امام بخاری کی جامع صحیح کی مشہور روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

لیحجن ھذا لبیت ولیعمرن بعد یاجوج وماجوج

اس گھر (بیت اللہ) کا حج اور عمرہ یاجوج و ماجوج کے بعد بھی لوگ کرتے رہیں گے۔

یاجوج و ماجوج دنیا کی جو قوم بھی ہو' لیکن اتنی بات تو قرآن سے بھی معلوم ہوئی ہے کہ قرب قیامت سے پہلے کھولی جانے والی قوموں کو یاجوج و ماجوج کا نام دیا گیا ہے اور یوں بھی اَلنّاس (انسانوں) کے قیام و بقا کو قرآن ہی میں جب اسی گھر کیساتھ وابستہ قرار دیا گیا ہے' تو یہ کیسے سوچا جا سکتا ہے کہ زمین کے اس کرہ پر آدمی (الناس) تو چلتے پھرتے رہیں اور وہ گھر (البیت) زمین کی پشت سے العیاذ باللہ غائب ہوجائے جس کے بغیر قرآن کی رو سے نہ یہاں کوئی چل سکتا ہے اور نہ پھر سکتا ہے۔

کچھ بھی ہو' آئندہ کیاہونے والا ہے' کن کروٹوں کو مستقبل میں دنیا لینے والی ہے' اس سے قطع نظر بھی کر لیا جائے' جب بھی عہد ابراہیمی سے بیسویں صدی عیسوی تک ہزاروں سال کا جو طویل و دراز وقفہ ہے' اس میں تو جنسِ لطیف کے ایک فرد کی بسائی ہوئی اس آبادی کو تاریخ کی نگاہوں نے ہمیشہ آباد ہی پایا ہے۔ عبرت و بصیرت کے لیے کیا یہی کافی نہیں ہے؟

کہتے ہیں کہ کلیات سے زیادہ انسانی فطرت جزئی مثالوں اور نظیروں سے متاثر ہوتی ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے زیادہ جزئی' واضح' صاف نظیر اور کیا ہو سکتی ہے کہ اجاڑ' چٹیل' ننگے' خشک پہاڑوں کے سوا جہاں اور کچھ نہ تھا' خوف اگر کہیں ہو سکتا ہے تو اس سے زیادہ خوف ناک جگہ کا شائد تصور ہی نہیں کیا جا سکتا' بھوک اور فاقہ کا خطرہ کسی مقام کے ماحولی حالات کی بنیاد پر پیدا ہو سکتا ہے تو اس خطرے کے سارے اسباب سے بن کھیتی کا یہ بیاباں معمور ہے' لیکن تاریخ کی اس طویل مدت میں پہلے بھی دیکھا گیا' اور اب بھی دیکھا جا رہا ہے' کہ اس آبادی میں بسنے والوں کو کھلایا بھی جا رہا ہے' پلایا بھی جا رہا ہے' اور امن و امان کی زندگی سے یہاں کے بسنے والے بھی اسی طرح مستفید ہوتے چلے آ رہے ہیں جیسے دنیا کے دوسرے خطوں کے آبادکاروں کو زندگی گزارتے ہوئے دیکھا جا رہا ہے۔ بلکہ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ شاید دوسروں سے ان کا حال ہر زمانہ میں کچھ بہتر ہی رہا ہے۔ حالات اور خصوصیات ہی اس سرزمین کے ایسے ہیں کہ کشور کشائی کے متوالوں کے لیے اس سرزمین پر کسی قسم کی کوئی کشش کسی زمانہ میں پیدا نہ

ہوئی۔ کبھی کبھی کوئی معمولی مقامی فتنہ اٹھا بھی تو اٹھنے کے ساتھ ہی دب گیا' اور خوف سے محفوظ رہنے کی ایک بڑی وجہ یہی ہوئی۔ اسی طرح ہر زمانہ میں یہ بھی دیکھا گیا کہ اس شہر کے رہنے والوں کی معاشی سہولتوں کی ذمہ داری عموماً باہر والوں کے دلوں میں مختلف وجوہ سے بیدار ہوتی رہی۔ مدت تک عرب کے باشندے یہ سمجھتے رہے کہ اس شہر کے باشندوں کی پشت پناہی انکے فرائض میں داخل ہے۔ خود کما کما کر جو کچھ پہونچاتے تھے وہ تو پہونچاتے ہی تھے۔ اس کے سوا بھی تلاش معاش میں جدھر بھی یہاں کے رہنے والے نکل جاتے تھے عربی قبائل ان کی حفاظت و نگرانی میں پیش پیش نظر آتے ہیں' اور آخر میں تو عرب سے باہر کی حکومتوں تک نے **الایلف** کی سند دے کر تجارتی کاروبار کے پھیلانے اور بڑھانے کا موقعہ اس شہر کے باشندوں کے لیے مہیا کیا۔

اور یہ واقعات تو اسلامی تاریخ کے آغاز سے پہلے کے ہیں۔ پھر وہی بستی جس کے متعلق **یسعیاہ** نبی نے یہ خبر دیتے ہوئے کہ "تو ترک کی گئی" اور کس طرح چھوڑی گئی کہ' بقول ان ہی کے "کسی آدمی نے تیری طرف گزر ہی نہ کیا" یعنی باہر والوں نے لالچ کی نظر سے اس سرزمین کو نہیں دیکھا تھا' اسی کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کرنے کے بعد جو والہانہ گیت ان کی کتاب میں اب بھی پایا جاتا ہے' یہ **یسعیاہ** کی کتاب کا باب ۶۰ ہے' اسلام' پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے صدیوں پہلے وہ فرما رہے تھے کہ

> اٹھ منوّر ہو' کیونکہ تیرا نور آ گیا' اور خداوند کا جلال تجھ پر ظاہر ہوا' کیونکہ دیکھ تاریکی زمین پر چھا گئی' اور تیرگی امتوں پر' لیکن خداوند تجھ پر طالع ہو گا' اور اس کا جلال تجھ پر نمایاں ہو گا' اور قومیں تیری روشنی کی طرف آئیں گی' اور سلاطین تیرے طلوع کی تجلی مین چلیں گے۔

بہرحال "تاریکی" کے بعد' اس شہر' بلکہ سارے عرب کا' بلکہ سارے جہانوں کا نور جب آ گیا' اور جو بستی تاریخ کے نامعلوم ایام سے چھوڑی ہوئی تھی اس کے منور اور روشن ہونے کا وقت آ گیا تو' جیسا کہ ان ہی **یسعیاہ** علیہ السلام نے فرمایا تھا' یہ دیکھا گیا' آگے اسی کتاب میں ہے' کہ اسی چھوڑی ہوئی بستی کو خطاب کر کے انہوں نے کہا:

> اپنی آنکھیں اٹھا کر چاروں طرف دیکھ' وہ سب کے سب اکٹھے ہوتے ہیں' اور تیرے پاس آتے ہیں' تیرے بیٹے دور سے آئیں گے اور تیری بیٹیوں کو گود میں اٹھا کر لائیں گے(۱۰)

اس شہر کے بیٹوں اور بیٹیوں کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں :۔

"اور بیگانوں کے بیٹے تیری دیواریں بنائیں گے' اور ان کے بادشاہ تیری خدمت گاری کریں گے"۔

اس میں حضرت یسعیاہ کا یہ الہامی کلام بھی ہے کہ

"میں تجھے ابدی فضیلت بخشوں گا' اور پشت درپشت کی شادمانی کا باعث بناؤں گا۔ تو قوموں کا دودھ ہی لے گی' ہاں بادشاہوں کی چھاتی چوسے گی۔"

اور جہاں اسلام کے بعد پیش آنے والے مذکورہ بالا واقعات کا تذکرہ اپنے مکاشفہ میں انہوں نے کیا ہے' اسلام سے پہلے بھی جو کچھ اس شہر میں دیکھا جاتا تھا اس کی طرف انہوں ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے کہ

اونٹوں کی قطاریں اور مدیان و عیفہ کی سانڈنیاں آ کر تیرے گرد بے شمار ہوں گی' وہ سب سبا (یمن) سے آئیں گے'اور سونا اور لوبان لائیں گے۔

یہ عرب کے غیر اسماعیلی لوگوں کا حال تھا۔ پھر اسماعیل علیہ السلام کے منجھلے صاحبزادے قیدار اور بڑ[illegible]ے کے نام کی تصریح کر کے فرماتے ہیں کہ

قیدار کی سب بھیڑیں تیرے پاس جمع ہوں گی۔ اور نبیط کے مینڈھے تیری خدمت میں حاضر ہوں گے۔

اور اسی کی بعد بیت اللہ الحرام کے لفظ کو انہوں نے دہرایا ہے۔ جس کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے کہ

میں اپنے شوکت کے گھر کو جلال بخشوں گا۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ "بائبل" کی معتبر کتابوں میں الیسع علیہ السلام کی یہ کتاب بھی جب شریک ہے' تو اہل کتاب آخر ان تصریحات کا مصداق کس علاقہ کو ٹھہرائیں گے ۔ یقیناً مکہ ہی کی گلیوں میں یہ تماشا نظر آتا ہے کہ اونٹوں سے بھری ہوئی ہیں۔ قیدار اور نبیط کی اولاد عرب کے سوا اور کہاں ان لوگوں کو مل سکتی ہے ؟

اور یہی کیا اللہ کے اس روشن ضمیر بندے کے اس مکاشفہ کے بعض فقرے تو اس سے بھی زیادہ عجیب ہیں۔ مثلاً یہ فقرہ کہ

یہ کون ہیں جو بادل کی طرح اڑے چلے آتے ہیں'اور جیسے کبوتر اپنے کابک کی طرف ؟

آج ہوائی جہازوں پر حجاج کے قافلے جو سرزمین حجاز میں پہونچ رہے ہیں ان کو دیکھ کر آپ ہی بتایئے کہ پوچھنے والا آخر کیا پوچھے۔ جب مسیح علیہ السلام سے سکیڑوں سال پہلے اس تماشے کو

دکھایا جا سکتا ہے' تو اسی باب کے ان الہامی الفاظ کا

میں پیتل کے بدلہ سونا لاؤں گا اور لوہے کے بدلے چاندی اور لکڑی کے بدلے پیتل

ان کا حاصل اگر یہ نکالا جائے کہ کم قیمت معمولی چیزوں کے بدلے حجاز کے علاقے میں قیمتی چیزیں کسی زمانے میں آنے والی تھیں' مثلاً آج مٹی کے تیل کے بدلہ امریکہ اور یورپ سے اس ملک میں جو سونا آ رہا ہے' تو استعارے کے رنگ میں یہ فقرہ آدمی کے ذہن کو کیا منتقل نہیں کر سکتا۔

بہرحال "اللہ ہمیں ضائع ہونے نہ دے گا" --- مکہ کی بسانے والی بزرگ خاتون کے اس ایمانی فقرے کی تکمیل مسلسل جس رنگ میں ہوتی چلی جا رہی ہے' کیا ہزار ہا ہزار سال میں پھیلے ہوئے جزئی واقعات بھی ان لوگوں کے لیے کافی نہیں ہو سکتے جو خدا کو بھی مانتے ہیں' اس کی ہمہ گیر فرماں روائیوں اور ہر جہتی پشت پناہیوں پر ایمان بھی رکھتے ہیں۔ **دُوْنِ اللّٰہ** (اللہ کے سوا) کی عبادت سے انکار انھوں نے اسی بنیاد پر کیا ہے کہ اپنے پوجنے والوں کو وہ نہ نفع پہونچا سکتے ہیں' اور نہ نقصان۔ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ پکارنے والوں کی پکار کو ان کا خالق معبود ہر جگہ سے ہر وقت ہر حال میں سنتا ہے۔ قرآن میں مسلسل ان کو یہ بھی پڑھایا گیا ہے کہ نوح نے اپنے رب کو پکارا اور رب نے نوح کی پکار سنی' ان کو کرب عظیم (بڑی کڑھن اور کوفت) سے نجات بخشی۔ اندھیریوں (ظلمات) میں یونس نے اپنے ظلم کا اعتراف کر کے خدا کی پاکی کا جب اقرار کیا تو خدا نے ان کی سنی۔ زکریا نے پکارا اور ان کی دعا قبول ہوئی۔ ایوب خدا کے قدموں پر لوٹے اور وہ چنگے کیے گئے' مافات کے ان کی تلافی کی گئی۔ ابراہیمؑ نے خدا ہی کو اپنے کے لیے کافی قرار دیا' خدا ان کے لیے کافی ہو گیا' اور ہوا کے سرد جھونکے سے آگ کے شعلے بدل دیے گئے۔ الغرض طویل فہرست تصوف کی کسی کتاب' یا تعویذ اور گنڈوں کی کسی بیاض میں نہیں' بلکہ براہ راست **ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ** میں ان باتوں کی پائی جاتی ہے' اور بار بار مختلف شکلوں میں اسی فہرست کا اعادہ اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ ان وسوسوں میں بھی غلطاں پیچاں ہیں کہ جیسے دون اللہ (اللہ کے سوا مخلوقات کے) پوجنے والوں کو اپنے معبودوں سے فائدہ نہیں پہونچتا' اسی طرح بجائے مخلوقات کے خالق ہی کی طرف اپنی ساری نیاز مندیوں اور اپنی ساری ضرورتوں اور حاجتوں کے رخ کو پھیر کر جب **اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ** (ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں۔) کے ساتھ خالق کا پوجنے والا متوجہ ہو جاتا ہے' تو اس کو بھی اپنے خالق و معبود کی دست گیریوں کی توقع نہ کرنی چاہیے۔

تقدیر کا بہانہ

ان میں کچھ لوگ جو درحقیقت روح اللہ (اللہ کی رحمت) سے اپنی امیدیں توڑے ہوئے ہوتے ہیں' لیکن بات بنانے کے لیے کبھی وہ تقدیر کے مسئلہ کی آڑ لیتے ہیں' اور کہتے ہیں کہ تقدیر میں جو فیصلہ ہو چکا ہے جب وہ بدل نہیں سکتا تو دعا کرنے میں ہم وقت کیوں ضائع کریں۔ حالاں کہ ٹھیک جس وقت وہ یہ کہتے ہیں' دیکھا جاتا ہے کہ وہ طبیبوں اور ڈاکٹروں کے پاس دوڑ بھی رہے ہیں' اور ان کی بتائی ہوئی دواؤں کو استعمال کر کر کے صحت کے امیدوار بنے بھی بیٹھے ہیں۔ ان ہی کے دل میں تقدیر کے فیصلہ کا اس وقت خطرہ بھی نہیں گزرتا۔ اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ تقدیر و تدبیر کے حدود کو خود ان کا جبلی وجدان بھی خوب پہچانتا ہے' خواہ اپنی یافت کے اظہار کا سلیقہ ان میں نہ پایا جاتا ہو۔

بہرحال جب مردہ و جامد' مجبور و معذور' دواؤں میں شفائی تاثیروں کی تلاش مسئلہ تقدیر کے مزاحم نہیں ہے' تو زندہ توانا' دانا و بینا' قادر و مقتدر' حیّ و قیوم کو پکار کر اپنے مشکلات کے حل کی جو امیدیں باندھتا ہے' اس کے سراسر عقلی اقدام کو مسئلہ تقدیر کا مخالف آخر کس بنیاد پر ٹھہرایا جاتا ہے۔ جن دواؤں کے اختیار میں کچھ نہیں ہے' بلکہ اختیار ہی سے کلیتاً" محروم ہیں' ان میں صحت کی جستجو اور شفایابی کی توقع اگر عقل کا اقتضاء ہے تو وہی عقل یہ کیوں نہ چاہے گی کہ جس کے اختیار میں سب کچھ ہے اسی پر اپنی حاجتوں کو پیش کیا جائے' اور جو کچھ مانگنا ہو اسی سے مانگا جائے۔

نعمت جب مل جاتی ہے تو اس کی صحیح قدروقیمت کا وزن دلوں میں باقی نہیں رہتا۔ ورنہ یہی اَلصَّلٰوۃ (یعنی نماز)' اس کی حقیت کیا ہے ؟ حاجتوں اور ضرورتوں میں ڈوبے ہوئے انسان کے لیے وہ دروازہ کھول دیا گیا ہے جس سے وہ اپنی پیش آنے والی ضرورتوں اور حاجتوں کو طلب کرتا رہے۔ وہ غلط راستوں پر پڑا ہوا تھا' بجائے خالق کے مخلوقات ہی سے امداد طلب کرنے لگا تھا' ان ہی ٹیڑھی ترچھی راہوں سے ہٹا کر براہِ راست خالق کے سامنے نماز آدمی کو لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔

وَاَنِ اعْبُدُوْنِیْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ۝ (یٰسین ۳۶ : ۶۱)

اور مجھی کو پوجتے چلے جانا' یہی ہے سیدھی راہ

کی قرآنی آیت کا یہی مطلب ہے اور جو ہر نماز میں نمازیوں کے رخ کو "بیت اللہ الحرام" یعنی خدا کی شوکت والے گھر کی طرف پھیرنے کا حکم ہے' اس حکم کی دوسری مصلحتوں کے ساتھ ایک

مصلحت یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ "خدائی امداد" کے ظہور کی وہ ایک زندہ تاریخی مثال بھی ہے۔ اسی گھر کے پاس جیسا کہ عرض کر چکا' ہاجرہؑ اور ان کے بچے کے ساتھ قدرتی پشتی بانیوں کا غیر معمولی مظاہرہ قدرت کی طرف سے ہوا۔ بلکہ عام لوگوں کو شائد معلوم نہیں کہ جس بچے کے ساتھ سِتنا ہاجرہ اس وادی میں تنہا چھوڑی گئی تھیں اس بچے کا نام اسماعیل' اس کا لفظی ترجمہ ہی یہ ہے کہ وہ خدا کی سنی ہوئی دعا تھے۔ آخر "جزایل" تو اللہ کا عبرانی تلفظ ہے' اور "اسماع" کا مادہ وہی عربی کا لفظ سمع (سننا) ہے۔ تورات کتاب پیدائش میں بھی ہے کہ سِتنا ہاجرہؑ کے پاس' جب وہ حاملہ تھیں' خدا کا فرشتہ آیا اور اس نے کہا کہ

> تو حاملہ ہے' اور تیرے بیٹا ہو گا' اس کا نام اسماعیل رکھنا' اس لیے کہ خداوند نے تیرا دکھ سن لیا (پیدائش ۱۶: ۶۲)

خیال کرنے کی بات ہے کہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ جس قوم کو یہ عملی مشق کرائی جاتی ہو کہ اس گھر کی طرف رخ کریں جو خدا کی سنی ہوئی اور قبول کی ہوئی دعا اسماعیل علیہ السلام' کی طرف منسوب ہے' اور جس گھر کے تعلق سے مسلسل اس کا تجربہ کرایا جاتا رہا ہے کہ عام اسباب کے لحاظ سے جہاں کچھ نہ تھا وہیں سب کچھ ہوتا رہا' بندوں نے پکارا اور سننے والے خدا نے سنا' بندوں کی آرزو پوری کی' اسی گھر کی طرف رخ کر کر کے

> آپ ہی کو ہم پوجتے ہیں اور آپ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں

کے ساتھ' کراہنے والوں اور اپنے مالک کے ڈھونڈھنے والوں کے لیے گنجائش ہی کیا باقی چھوڑی گئی ہے کہ ظاہری اسباب کی ناسازگاریوں کو دیکھ دیکھ کر وہ لرزہ براندام ہوں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اسباب کی ناہمواری ان میں اس امید کو پیدا کرتی ہے کہ بیت اللہ الحرام کے رب کا ہاتھ براہِ راست نمایاں ہو گا' اور اس گھر کی مسلسل تاریخ میں جس کا بار بار مشاہدہ کرایا گیا ہے' پھر اسی تعلق سے اپنی اعجوبہ طرازیوں اور طرفہ تماشائیوں کے ساتھ وہ اپنے بندوں کے سامنے آئے گا' اور ضرور آئے گا۔

کیسی عجیب بات ہے کہ اس مرکز کی طرف پانچوں وقت نماز پڑھنے والی امت کے حافظے سے دیکھا جا رہا ہے کہ' کچھ دنوں سے اس گھر اور اس گھر کی تاریخ کی یاد کو مٹا مٹا کر چند استثنائی مقامات جہاں سے مسلمانوں کو ہٹنا پڑا' مثلاً اسپین یا سسلی' وغیرہ کی اہمیت کو مرتکز کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ حالانکہ تیرہ سو سال کی طویل مدت میں خدا ہی جانتا ہے کہ مسلمان دنیا کی کن کن قوموں کے ساتھ جا کر آباد ہوئے' اور جہاں کہیں آباد ہوئے بحمد اللہ اس وقت تک وہ

وہیں جمے ہوئے ہیں۔ تورات کی پیشگوئی نوٹ میں نقل کر چکا ہوں کہ

وہ اپنے ہر ایک بھائی کے ساتھ سکونت کرے گا۔

ان کی تقدیر ہی "من کل اخاء یسکن" ہے۔ لوگوں کو نہ شام یاد رہا نہ مصر نہ لیبیا نہ مراکش نہ ایران نہ ترکستان نہ چین نہ ہندوستان نہ جاوا نہ ساترا اور یاد رہ گیا تو صرف ایک اسپین یا اسی یورپ کا جزیرہ سسلی، جہاں ان کی تعداد ہی بہت تھوڑی تھی اور آبنائے جبل الطارق کے اس پار صرف بارہ میل کے فاصلہ پر افریقہ میں انکی قاہرہ حکومت قائم تھی، اور وہاں سے مسلسل ہندوستان تک صرف ان ہی کے علاقے تھے۔ اگر حالات کے لحاظ سے تیرہ سو سال کی طویل مدت میں بارہ میل کا فاصلہ طے کر کے دارا لکفر کو چھوڑ کر مسلمان دارالاسلام میں منتقل ہو گئے اور واقعات کے تحت محکومیت کی زندگی کو چھوڑ کر ان علاقوں میں واپس آ گئے جہاں کے وہ حاکم تھے، تو بار بار اسی کی یاد کو تازہ کر کر کے مسلمانوں کو ہول دل میں مبتلا کرنے والے کیوں نہیں سوچتے کہ آخر وہ کیا کر رہے ہیں۔ ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ مسلسل ہر روز پانچوں وقت جن کے حافظے میں "بھوک میں کھلانے والے، اور خوف سے امن دینے والے، بیت اللہ کے رب" کی یاد تازہ ہوتی رہتی ہے، ان پر صرف اندلس اور سسلی کے منتر کا اثر دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اور جب تک

فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَٰذَا الْبَيْتِ الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ ○

(القریش ۱۰۶: ۳-۴)

پس پوجتے چلے جانا اس گھر کے رب کو جو ان کو بھوک سے کھانا کھلاتا رہا اور خوف سے امن بخشتا رہا۔

کے قرآنی حکم کی وہ تعمیل کرتے رہیں گے، بیت اللہ کا یہی رب ان کو کھلاتا بھی رہے گا اور خوف سے امن بھی بخشتا رہے گا۔

اور مجھ سے پوچھتے ہیں تو جو واقعہ ہے اسی کو عرض کروں گا۔ جس وقت ہماری لاری مکہ معظمہ سے قریب ہوتی چلی جا رہی تھی، میرے دل میں تڑپ اسی "بیت اللہ" کی دید کی تھی جس کے رب کا نام تو ہمارے کانوں میں اسی وقت ڈالا گیا تھا جب اپنی ماؤں کے پیٹ سے نکل کر زمین کی خاکی کرہ پر ہم ڈالے گئے تھے، اور نام سے پہلے ہم اس کی ربوبیت کے کام کا اقرار "بلیٰ" کے لفظ سے اسی وقت کر چکے تھے جب ناسوتی دنیا سے ہمارا تعلق بھی قائم نہ ہوا تھا۔ وہ ہمارے لیے جانا پہچانا تھا اور ہم تو خیر اس کے بندے ہی تھے۔ جو کہتے ہیں کہ ہمیں "خانہ" کی نہیں بلکہ "خانہ کے خدا" کی تلاش ہے، ان پر دل ہنستا تھا۔ بھلا جس خدا کے بغیر ہم اپنی ایک سانس بھی نہیں لے

سکتے' جس سے ایک لمحہ کے لیے نہ ہم غائب ہوئے اور نہ ہو سکتے تھے' اور جس سے غافل ہو کر جینا کفر کی زندگی ہے' یہ کیسے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اسی خدا کو ڈھونڈھتے ہیں۔ ڈھونڈھا تو وہ جاتا ہے جو کھو گیا ہو' اور جو ایسا ہو کہ وجود' وجود کے سارے کمالات ہی کو جس کے بغیر ہم کھو بیٹھیں گے' ایسے پائے ہوئے کو یہ دیوانے کیسے کہتے ہیں کہ ہمیں اسی کی تلاش ہے۔

بہرحال وہ کچھ بھی سوچتے ہوں' لیکن ہم تو اپنے اسی "رب" کے "بیت" ہی سے اپنی آنکھیں سینکنا چاہتے تھے' اور اس بیت پر ایک نظر اسی کو حاصل عمر خیال کیے ہوئے تھے۔ اسی کے جمال و حسن کے تصور میں ہم میں سے ہر ایک محو تھا۔ کیوں کہ حقیقت حقیقت ہی کے رنگ میں نظر آئے' اس کے لیے جن احساسات کی ضرورت ہے ان سے ہر ایک لب ریز تھا۔ ان میں ہر ایک اس بات کا گواہ بن کر جا رہا تھا کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ کہہ چکا ہوں کہ ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں' سن رہے ہیں۔ اپنے احساسات کے زیر اثر ہو کر ان کو دیکھ اور سن رہے ہیں' غلط احساسات ہی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ الماس ہمیں شیشہ کا ایک ٹکڑا بھی نظر آ سکتا ہے' اور احساسات کی تصحیح کا ثمرہ ہے کہ جو الماس ہے اس کو ہم الماس ہی باور کرتے ہیں۔ جس وقت میقات کے حدود سے گزر کر ہم ان حدود میں داخل ہوئے جن کو حرم کے حدود کہتے ہیں تو جو کچھ بھی ہمارے سامنے تھا' ممکن ہے دوسروں کو وہ دشت و بیابان' پہاڑ اور میدان نظر آتے ہوں' لیکن اپنی نگاہ جدھر بھی جاتی تھی ہر ایک سے "حرمات اللہ" ہی کی برقی لہریں نکل نکل کر ہمارے احساسات میں پیوست ہوتی چلی جا رہی تھیں' اور اس وقت سمجھ میں آتا تھا کہ "حرمات اللہ" کو قرآن میں "شعائر اللہ" کیوں کہا گیا ہے۔ اللہ کا شعور ان سے دلوں میں کس طرح بیدار ہوتا ہے' اسی کا ذاتی تجربہ ذرّے ذرّے' تنکے تنکے' حدود حرام کے' کراتے چلے جا رہے تھے۔